**OPEN ACCESS**
*Iḥyā᾽al῾ulūm*
*ISSN (Online): 2663-6263*
*ISSN (Print): 2663-6255*
*www.joqs-uok.com*

*Iḥyā᾽al῾ulūm, Vol.:24, Issue:1, Jan-June 2024*
*PP: 90-109*

# مابعد جدیدیت کے مسلم معاشرے پر تمدنی اثرات

# *"Postmodernism's Cultural Impact on Muslim Societies"*

***Azhar Hussain***
*Lecturer (visiting), Office Administrator, Department of Philosophy*
*University of the Punjab*
***Prof. Dr. Tahira Basharat***
*Dean Academics and Director Curriculum Design and Development*
*FMH*
*College of Medicine & Dentistry Lahore.*
*tahira.basharat@fmhcmd.edu.pk*

## Abstract

*In modernism, the perspective was that this world is deterministic, discoverable through reason, experience, and observation, and that all its truths can be accessed on a scientific basis. Therefore, for the discovery of facts, there was no need for any other source, nor was there any existence of such a source; only those facts were considered credible that met the standards of reason, experience, and observation. Descartes presented the theory of "I think therefore I am," which is considered the foundation of modern Western thought. This implied that the conscious act of the ego is the only path to truth, rendering religion and God unnecessary, culminating in the idea of "The Death of God."After 1970, a new theory called "postmodernism" emerged, which eventually became a movement. It not only rejected all the theories of modernism but also denied God, religion, and all the elements that form their basis, such as history, writing, speech, collective theories, and universal truth. In this way, postmodernism gave rise to a situation that created a virtual world in the form of computers, TV, LCDs, advertisement screens, mobiles, and countless apps, and also led to the development of artificial intelligence in the form of robots, automatic factories, large data centers, and Chat GBT. While postmodernism provided numerous conveniences and facilities for humanity, it also influenced the cultural conditions of every society. Western societies, already inclined towards materialism under the influence of modernism, were further strengthened by this. Conversely, the Pakistani Muslim society experienced negative cultural impacts at an*

CC BY

*extraordinary rate. These effects are evident in factors such as a religiously empty educational system in our institutions, the determination of priorities and motivations at home through TV, cable, internet, and mobiles, the growing religious indifference among the youth, and declining moral standards. It is essential to highlight the issues arising from postmodern theories and conditions and to take practical steps for their resolution.*

*Keywords: Culture, Post-modernism, Religion, Artificial Intelligence, Derrida*

مابعد جدیدیت کا محرک دورِ جدیدیت تھا۔ اور جدیدیت کے محرکات میں کئی صدیوں کے حالات اور ذہنی ارتقاء کا عمل دخل موجود تھا۔ قبل از جدیدیت کے تمام ادوار کو اگر یکجا کر کے دیکھا جائے تو معلوم تاریخ کے مطابق وہ اندازاً دس ہزار قبل مسیح سے لیکر چودہ سو بعد از مسیح تک کا دور کہلایا جاتا ہے، اس دور میں انسانوں کی علمی اور فکری تشکیل کی بنیاد الہام، عقیدہ، سند اور تقلید وغیرہ پر تھی، جبکہ سماجی صورتحال میں انسان کا بنیادی ذریعہ معاش زراعت اور رہن سہن کے اصول قبائلی اور دیہاتی انداز پر تھے، پھر اسی دور میں بڑے بڑے شہر وجود میں آئے، جن کی وجہ سے پھر حکمرانوں کا ظہور ہوا۔ ہر سلطنت کسی نہ کسی الہامی یا غیر الہامی مذہب اور اس کے تمدن پر قائم تھی۔[1]

**جدیدیت**

چارلس جینکس کے نزدیک جدیدیت کا دور 1750 عیسوی سے 1950 عیسوی تک کا دور ہے، جس کی خاصیتیں یہ ہیں کہ اس میں صنعتی انقلاب نمودار ہوا، پیداواری ذرائع میں ناقابل فراموش تبدیلیاں سامنے آئیں، بڑی تعداد میں فیکٹریاں پیداوار بڑھانے لگیں، زراعت کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام نے لے لی، الہامی قوانین کی جگہ سیکولر، لبرل اور کیپیٹل قوانین نے لے لی۔ اور ان تبدیلیوں کے برعکس ان کے متاثرین اور ناقدین بھی موجود رہے، جن کے اثرات بھی جدیدیت کے سماج میں واضح دیکھے جاسکتے تھے، جن کی کچھ شکلیں مزدوروں، کسانوں، دیہاڑی داروں، فاقہ کشوں، اور غربت کے ماروں کی شکل میں موجود تھیں، اسی طرح بے مہار ترقی کا تصور بھی اسی دور کی دین ہے، انسان پرستی، معاشرے پر فرد کو فوقیت، قوم اور وطنیت پرستی، معاملات، نظریات، الٰہیات، تجارت اور ریاست کے معاملات میں عقل کو باقی تمام چیزوں پر زیادہ فوقیت، سائنس کی ترقی اور مشینوں کی حکومت، طاقت کی پرستش، بیانیے، یوٹوپیاز، مہابیانیے، آفاقی سچائیاں اور انسان کی آزادی اور خود مختاری جیسے تصورات بھی اسی دور کی دَین ہیں۔[2]

مذہبی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو جدیدیت کے دور میں مذہب کی بنیاد یعنی وحی کی جگہ عقل کو برتری دینے کا آغاز ہوا، اور اسی طرح سند کی تصدیق کے بجائے تجربے کے نتیجے کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ اسی طرح معاشرتی طور پر اہمیت کی حامل رسوم ورواج، روایتیں اور مذہبی رجحانات کے بجائے جدید طرز زندگی کے نظریات مثال کے طور پر سیکولر طرز بود و باش کو اہمیت حاصل ہوتی گئی۔

"اسلام اور جدیدیت کی کشمش" کے مصنف محمد ظفر اقبال کے نزدیک جدیدیت اور اسلام دو الگ الگ مقاصد سے پھوٹنے والے سوتے ہیں جو ایک دوسرے سے اصلاً متصادم اور متغائر ہیں، اس تصادم اور غیریت کی کم از کم معنویت یہ ہے کہ ایک کے بنیادی تصورات اور تشکیل و تدریج میں دوسرے کا عمل دخل ناممکن ہے۔[3]

سارتر نے اس معاملے میں بڑی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ اب شدت سے اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان کو آزاد کرایا جائے، اور انسان ہی کو قادر مطلق سمجھا جائے۔ ہم خدا کا انکار کر چکے ہیں تاکہ انسان خود اپنے وجود کی مطلقیت پہچان سکے۔[4]

انسان خود اس قابل ہے کہ وہ سچائی کو پہچان سکے، اس کے پاس وہ سب چیزیں موجود ہیں جو کہ سچائی تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی

ہیں، مثلاً عقل، حواس، تجربات، مشاہدات وغیرہ۔ اب انسان کو کسی خارجی ذریعہ علم کی ضرورت نہیں۔

اسی طرح تھامس ورگش جدیدیت کی ایک تعریف یوں کرتا ہے کہ

"جدیدیت کی اس کے تمام مظاہر میں سب سے نمایاں اور دیرپا کامیابیوں میں سے ایک اس بنیاد کی قدر میں کمی ہے کہ ہم ایک 'مقصد' حقیقت پر قابض ہیں، جو انسانی ادراک کے لیے قابل رسائی لیکن آزاد ہے۔"[5]

ڈاکٹر منظور احمد کے بقول جدیدیت کو اس سے قبل روشن خیالی کہتے تھے، یہ ایک ایسا طرز فکر ہے جس کی بنیاد عقل پر ہے اور وہ آزادی، مساوات اور حقوق انسانی جیسے تصوارت پر معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔[6]

ڈاکٹر عبدالوہاب سوری کے بقول جدیدیت جن بنیادوں پر اپنے علم کو قائم کرتی ہے وہ یہ ہیں۔

1- پوری کائنات کا مرکز و محور انسان ہے (Anthropocentricity)

2- آزادی (Freedom)

3- مساوات (Equality)

4- عقلیت (Rationality)

5- ترقی (Progress)[7]

### مابعد جدیدیت

مابعد جدیدیت کو انگلش میں پوسٹ ماڈرن ازم (Postmodernism) اور اسے مختصراً (Pomo) بھی کہا جاتا ہے۔ مابعد جدیدیت بنیادی طور پر کوئی منظّم فلسفہ نہیں ہے کہ جس میں باقاعدہ طور پر کسی ایک پیرائے میں اور کسی ایک نظریاتی اساس پر گفتگو کی گئی ہو۔ یہ ایک غیر منظّم اور زندگی کے ہر شعبہ فکر کی غیر مربوط، غیر منظّم اور ناپائیدار اور قدرے عیاش ذہن کے ساتھ ایک عارضی تشریح ہے۔

چارلس جینکس کے مطابق "Charles Jencks" پوسٹ ماڈرن (Postmodern) کی اصطلاح کو سب سے پہلے Arnold J. Toynbee" آرنلڈ ٹائن بی نے تاریخی ادوار کے معنی میں استعمال کیا۔[8]

ڈاکٹر اقبال آفاقی کے نزدیک لفظ پوسٹ ماڈرن "Postmodern" سب سے پہلے ایک انگریز مصور جان واٹکنز نے 1870ء اپنی ایک تصویر کی وضاحت کرتے ہوئے استعمال کیا، جبکہ بعد میں ایک امریکی مصنف برنارڈ آئیڈنگز بیل نے ایک "Bernard Iddings Bell" کتاب بعنوان "Postmodernism and Other Essays" "مابعد جدیدیت اور دوسرے مضامین" کے عنوان سے 1926 میں شائع کی جس میں اس نے مابعد جدیدیت کو نسبتاً وسیع معنوں میں استعمال کیا۔[9]

ایک خیال کے مطابق لفظ پوسٹ ماڈرن ازم کا پہلی بار استعمال 1917 میں روڈولف پنویز (Rudolf Pannwitz) نے مغربی ثقافت کی انکاریت کے فلسفے کو بیان کرنے کے لیے کیا۔[10]

ویکیپیڈیا کے مطابق مابعد جدیدیت کی اصطلاح کا آغاز تنقیدی نقطہ نظر سے ہوا۔ مابعد جدیدیت نے اپنے تنقیدی نظریات کا زیادہ تر رخ ادب، ڈرامہ، فن تعمیر، سینما، ڈیزائن، مارکیٹنگ، بزنس، تاریخ، قانون، کلچر اور مذہب کی جانب رکھا۔[11]

کچھ مفکرین کے مطابق مابعد جدیدیت کسی نظریے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک مخصوص دور کا نام اور اس دور کی مخصوص کیفیتوں کا نام ہے۔[12]

اہاب حسن مابعد جدیدیت کے ایک مشہور تنقیدی مفکر ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین میں بہت کثرت سے مابعد جدیدیت کی اصطلاحات اور نظریات بیان کیے ہیں۔ ان کا ٹیبل بہت مشہور ہے جو کہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے درمیان فرق کو واضح کرنے کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔[13]

مابعد جدیدیت کا آغاز کب اور کیسے ہوا، اس کے بارے میں مختلف مفکرین کے ہاں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی صاحب کے نزدیک مابعد جدیدیت فکر 1950 میں خاموش انداز سے ادبی اور فکری منظر نامے پر آچکی تھی، جبکہ 1960 کی دہائی کے آخر میں اس کے خدوخال واضح ہونا شروع ہوئے جبکہ اسے عروج 1980 کی دہائی میں ہوا، جب امریکی اخبارات بالخصوص نیو یارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ اور لاس انجلس ٹائمز میں ایسے مضامین شائع ہونا شروع ہوئے جن میں پوسٹ ماڈرن ازم کا لفظ یا اصطلاح استعمال کی گئی۔[14]

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ 1970 کے قریب ایک نئے نظریے مابعد جدیدیت نے باقاعدہ جنم لیا، جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ صرف لفظی طور پر ہی نہیں بلکہ اپنے پورے فلسفے میں جدیدیت سے بھی دو قدم آگے ہے۔ آسان الفاظ اور دو لفظی انداز میں اگر کہا جائے تو مابعد جدیدیت موجودہ دور کی صورتحال پر بہت سے مفکرین کے افکار و نظریات کا مرکب کہی جاسکتی ہے۔ البتہ کسی ایک تھیوری، کسی ایک نظریے یا کسی مخصوص معاشرے کے بارے میں ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ یہ ہے مابعد جدیدیت کا اصل خلاصہ یا اصل نمونہ۔

ڈیکارٹ نے "I think therefore I am" (میں سوچتا ہوں، اس لئے میں ہوں) کا مشہور اعلان کیا جو مابعد جدید فلسفہ کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خودی کا شعوری عمل (Conscious Act of Ego) سچائی تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے۔[15]

مابعد جدیدیت کے بڑے بڑے مفکرین میں جو نام آتے ہیں ان میں لیوتار، Jean francois Lytard(1924-1998) مشعل فوکو، Michel Foucault(1926-1984) دریدا، Jacques Derrida(1930-2004) Jean بادریلا، Baudrillard(1929-2007) چارلس جینکس، Charles Jencks(1939-2019) Julia جولیا کریسٹیوا، Kristeva(1941- رولاں بارتھ، Roland Barthes(1915-1980) Jacques Lacan (1901-1981) لاکان، رچرڈ رورٹی Richard Rorty (1931-2007) اہاب حسن، Ihab Hassan(1925-2015) ڈیلیوزی Gilles Louis René Deleuze (1925-1995)، جرگن ہیبر ماس Jurgen Habermas (1929ء)، گیاٹری Gayatri Chakravorty Spivak (1942ء)، زغمنٹ باؤمین Zygmunt Bauman (1925-2017ء)، وٹیمو Gianteresio Vattimo (1936)، ڈوگلیس کیلنز Douglas Kellner (1943)، التھوسر Louis Althusser(1918-1990)، جیمی سن Fredric Jameson (1934) وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں جن لوگوں نے مابعد جدیدیت پر لکھا ان میں، ڈاکٹر وزیر آغا (1922-2010ء)، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (1932-2022ء)، ڈاکٹر فہیم اعظمی، ضمیر علی بدایونی، نظام صدیقی، ناصر عباس نیر شامل ہیں۔

**مابعد جدیدیت کے دائرے:**

کہا جاتا ہے کہ 1980 اور 90 کی دہائی کے عرصے میں مغرب کے لیے مابعد جدیدیت ایک نہایت دلکش اور مشہور ترین فلسفہ بن چکا تھا، شاعر، ادیب، فلسفی، تاریخ دان، اخباری مدیران، مصور سب کا موضوع بحث مابعد جدیدیت اور مابعد صورتحال تھی، یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مابعد اصطلاحات اور صورتحال پر دونوں طرح کے بیانیے سامنے آرہے تھے، یعنی مابعد جدیدیت کے حق میں بھی اور اس کی مخالفت میں بھی۔ اور یہ عمل تاحال جاری ہے، لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کے حق میں اور اس کی مخالفت میں اتنا زیادہ لکھے جانے کے باوجود اس کے بہت سے نظریات کے بارے میں تذبذب اور تجسّس میں کمی نہ ہوسکی، بلکہ اس میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ یہ سوال ہمیشہ رہا کہ آخر مابعد جدیدیت ہے کیا چیز، مابعد جدیدیت مذہب، سیکولرازم، اشتراکیت، مارکسزم، لبرل ازم، کیپٹلزم، روشن خیالی اور جدیدیت وغیرہ کی مخالف ہے یا اس کی حامی۔

چارلس جینکس Charles Jencks کے مطابق مابعد جدیدیت کا بنیادی تعلق فلسفہ، فنون لطیفہ، ادب، فنِ تعمیر اور ترقی یافتہ دنیا کی سماجی صورتحال سے ہے، سماجی صورتحال میں سماجی ناہمواریاں، اخلاقیات، ثقافت، میڈیا اور انٹرنیٹ وغیرہ ہے۔

ڈاکٹر اقبال آفاقی کے نزدیک مابعد جدیدیت پانچ زاویوں سے اپنی تنقید پیش کرتی ہے۔

1- تاریخ پر تنقید
2- علم پر تنقید
3- معنی پر تنقید
4- انسانی موضوعات پر تنقید
5- فلسفے پر تنقید

فلسفہ میں مابعد جدیدیت کو نظریاتی بنیادیں لیوتار نے فراہم کیں، جس کا اظہار اس کی کتاب "The Post Modern Conditions" میں واضح ہے۔ اس کتاب میں لیوتار خود کہتا ہے کہ اس کے اس کتاب کو لکھنے کا مقصد مابعد جدیدیت اور انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں علم کا جائزہ لینا ہے۔

مابعد جدیدیت کو اس کی تحریک کے پس منظر میں دیکھا جائے تو وہ اضافیت پسند رجحانات کی طرف جھکاؤ رکھتی ہے، جبکہ ہر معاملے میں تشکیک کی قائل نظر آتی ہے۔ اسی طرح انسانی کی عمومی اور سیاسی سرگرمیوں کو ہی عقلیات کی بنیادی تشریحات قرار دیتے ہوئے اپنا نقطہ نظر بیان کرتی ہے۔ مثال کے طور پر سچ اور جھوٹ کے بارے میں مابعد جدیدیت کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ سرے سے ہی غیر متعلقہ اصطلاحیں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ سچ بذات خود کوئی خارجی حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ سچ کچھ نہ کچھ مخصوص حالات کی بدولت ہی برآمد ہوتا ہے، اور یہ بھی کہ ثقافتی سیاق و سباق کا بھی سچ کی تشکیل میں اہم کردار ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہ انسان جو زبان بولتے ہیں وہ اپنی اس حیثیت میں خود مختار ہیں، اور اس کی مثال شفاف آئینے جیسی ہے، جس طرح آئینے میں ہم اپنی شکل دیکھتے ہیں پھر اسی کو ہی سچ سمجھ لیتے ہیں۔

اسی طرح مابعد جدیدیت کا طریقہ یہ ہے کہ بڑے بڑے اور ہمہ گیر نظریات کی بجائے چھوٹے چھوٹے، معمولی، عارضی بیانیوں کو فوقیت دیتی ہے۔ مابعد جدیدیت پر سب سے زیادہ کام فرانس میں ہوا، فرانس کے بعد مابعد جدیدیت پر کام کرنے کے حوالے سے امریکہ کا نام آتا ہے۔

اب مابعد جدیدیت کے ان نظریات یا اس صورتحال کو تفصیل سے بیان کیا جائے گا جن کی وجہ سے ہمارے مذہبی معاشرے شدید متاثر ہوتے نظر آتے ہیں۔

**عظیم بیانیے:**

مابعد جدیدیت کے نزدیک سچائی، اقدار، اور عقلیت وغیرہ سب اضافی چیزیں ہیں۔ اگر ایک بات ایک جگہ پر سچ ہو سکتی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ دوسرے مقام پر بھی سچ ہو۔ کیونکہ کہ ہر شخص کی انفرادی پسند ناپسند اپنے حالات کے مطابق ہوتی ہے۔

مابعد جدیدیت کے مفکرین ہر قسم کے دعوؤں اور سچائیوں کو مہابیانیہ سے تعبیر کرتے ہیں، جن کی حیثیت ان کے نزدیک صرف اور صرف کہانیوں اور لوک داستانوں جیسی ہے۔

لیوتار مابعد جدیدیت کے فلسفیوں میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اس نے ہر قسم کے مہابیانیے کا انکار کر دیا۔ اس نے مہابیانیے کو ختم کرنے یا اس کے اثر کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس موضوع پر اس نے ایک کتاب تحریر کی جس کا نام ہے "The Postmodern Condition: A Report on Knowledge" لیوتار نے اپنی اس کتاب کے آغاز ہی میں اس کے تعارف کے طور پر تحریر کیا کہ اس کا مقصد انتہائی ترقی یافتہ معاشروں میں علم کی صورتحال کا جائزہ لینا ہے۔[16]

یعنی کہ مابعد جدیدیت کو وہ صرف انتہائی ترقی یافتہ معاشروں ہی کی علمی صورتحال سمجھتا ہے۔ جبکہ صورتحال اس سے مختلف ہے۔ یہاں تک تو درست ہے کہ مابعد جدیدیت کا آغاز ترقی یافتہ ممالک ہی سے ہوا لیکن اس کے اثرات جس شدت سے ترقی پزیر ممالک نے قبول کیے وہ ایک

ناقبل تردید حقیقت ہے۔

"I define postmodernism as incredulity towards meganarratives."[17]

"یعنی میں مابعد جدیدیت کی تعریف مہابیانیہ پر عدم اعتماد کی صورت میں کرتا ہوں"

لیوتار کا بنیادی نظریہ مہابیانیہ کی موت کا ہے، مہابیانیہ اس سچائی کا نام ہے جس کو کوئی بھی تہذیب یا مذہب ناقابل تردید اور حتمی سچائی کا درجہ دیتا ہے اور اس کے لیے لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا ہے، حقیقت میں یہ سب ایک لسانی کھیل ہے اور کسی بھی لسانی کھیل کو حتمی سچائی میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔[18]

یعنی اس کے نزدیک تمام مذہبی دعوے صرف لسانی کھیل کا نتیجہ ہیں ورنہ کسی حتمی سچائی کا کوئی وجود نہیں۔ان کے خیال میں زندگی صرف کا دور (Micro Narratives)جذبات اور احساسات سے مزین ہے۔لیوتار کے نزدیک مہابیانیہ کی بجائے اب چھوٹے چھوٹے بیانیوں ہے، اور ہم انہیں کے سہارے اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں، یعنی مذہب کے بیانیے سمیت کسی بیانیے کا اب دور نہیں رہا۔

یہ دور اب ایک دوسرے سے متضاد اور مخالف نظریات کا دور ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص خدا پر ایمان نہیں بھی رکھتا تو وہ اپنے روحانی سکون کے لیے کسی پیر فقیر کے پاس بھی جا سکتا ہے، اور کسی عیسائی یا ہندو کے پاس بھی۔ کیونکہ اسے مطلب سکون سے ہے نہ کہ مذہب سے۔

ٹیکچر، ادب، موسیقی، وڈیوز، سینما گھر وغیرہ جو کہ اس عہد کی نمایاں علامات ہیں یہ سب جیمی سن مابعد جدید دور کے متعلق کہتا ہے کہ آرکی بے معنی اور بے فائدہ چیزوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہر چیز بے مائیگی کا شکار ہوتی جا رہی ہے، اور یہ بھی کہ ہم ایک خطرناک مسلسل موجود رہنے والے دور میں رہ رہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں معاشرہ اپنے ماضی سے مکمل طور پر کٹ چکا ہے۔ گہرائی سے محروم سطحی معاشرے ایک گلوبل میڈیا کے بے مرکز میدان میں ایک دوسرے سے تماشہ کرنے میں مصروف ہیں۔[19]

ژاں بادریلا کے مابعد جدید دور کے متعلق تین نکتے اس کی واضح تصویر کشی کرتے ہیں۔ پہلے میں اس کے نزدیک مابعد جدید سماج صرف پیداواری صلاحیت اور صارفیت پر منحصر ہے۔ اس نے صارفیت کو کچھ اس طرح بیان کیا کہ ڈیکارٹ کے مشہور جملے "میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں" کو کچھ یوں بدل دیا کہ "میں صرف کرتا ہوں اس لیے میں ہوں" اس کی دلیل دیتے ہوئے وہ مثال دیتا ہے کہ جیسے کوئی انسان جانوروں کے درمیان پرورش پائے تو اس میں جانوروں جیسی خصوصیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں اسی طرح مابعد جدید سماج کے لوگ بے جان اشیاء کی دنیا میں پروان چڑھنے کی وجہ سے ان اشیاء جیسے بن گئے ہیں۔

دوسرا یہ کہ میڈیا کے سائے میں ابھرنے والے معاشرے میں حقیقت کی اور جنس کی موت واقع ہو چکی ہے۔ جو کچھ حقیقی تھا اس کی جگہ ٹی وی اور کمپیوٹر کی برقیاتی شبیہوں نے لے لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اب اشتہار کی صنعت، ٹی وی، اور کمپیوٹر کی غیر حقیقی دنیا میں زندہ ہے۔

تیسرا اس کے نزدیک مابعد جدیدیت کو روایتی سیاسی اصطلاحوں میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ موجودہ میڈیائی انقلاب سے معاشرے کی کایا پلٹ چکی ہے۔

یہ معاشرے اب صرف شبیہوں کی دنیائیں ہیں، اب کیا حقیقت ہے وہ ذرائع ابلاغ طے کرتے ہیں۔ ہماری خواہشات بھی ایک ثقافتی یلغار کے زیر اثر ہیں جو کہ اب ہمارے اپنے کنٹرول سے باہر ہیں، یعنی ہماری خواہشات بھی وہی ہونگی جو شبیہی انقلاب طے کرے گا، بس شبیہات اور نقول ہیں جو حقیقت سے زیادہ حقیقی ہیں۔ وہ اس عمل کو Simulations قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ ڈزنی ورلڈ کی مثال کہ وہاں ہر طرح کے شبیہی سین موجود ہیں جو کہ حقیقی نہیں لیکن حقیقی سے زیادہ خوبصورت ہیں۔[20]

## آفاقی سچائی:

مابعد جدید مفکرین کے نزدیک کسی بھی آفاقی اور حتمی سچائی کا تصور محض ایک وہم یا خیال ہے، یعنی دوسرے لفظوں میں اسے یو ٹوپیا (Utopia) بھی کہا جاسکتا ہے۔ سچائی کی حقیقت صرف یہ ہے کہ یہ محض ہمارے دیکھنے اور مشاہدے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جبکہ ہمارے دیکھنے یا کسی چیز کا بغور مشاہدہ کرنے کا تعلق ہمارے ذہن کی تخلیقی سرگرمی سے ہوتا ہے۔ یعنی اس کے بعد ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہوتے ہیں وہ اصل سچائی نہیں ہوتی، بلکہ ہم وہی دیکھتے ہیں جو اصل میں ہم دیکھنا چاہتے ہیں، یا یہ بھی کہ جو کچھ ہمیں ہمارا حال اور ظرف ہمیں دیکھاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ذہن فی الحقیقت سچائی کو ڈھونڈتا نہیں ہے بلکہ اسے تخلیق کرتا ہے۔ اور ہر ذہن کے سچائی تلاش کرنے کے عمل کی ترتیب اس شخص کے پسند ناپسند، اور حال احوال کے نتیجے میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ جس کا یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ایک ہی وقت میں بہت ساری اور مختلف قسم کی سچائیوں کی تخلیق ممکن ہے۔ اس لیے کسی ایک ترتیب کی سچائی کو حتمی نہیں کہا جاسکتا۔

اسی طرح یہ بھی کہ یہ دنیا حقیقی، ٹھوس، اور مظاہر کے بجائے ایسے عکسوں (Images) پر منحصر ہے جو کہ غیر حقیقی اور غیر محسوس ہیں۔ دوسرے لفظوں میں دنیا ایک وڈیو گیم کی طرح ہے، جس میں ہم اپنی پسند کی سچائیاں دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔

کئی مابعد جدید مغربی مصنف آفاقی سچائی کے تصور پر شکوک و شبہات کا اظہار کرتے ہیں یا صریح انکار۔ کچھ قابل ذکر شخصیات میں مشل فوکو، دریدا، ژاں فرانکوئس لیوٹارڈ، اور رچرڈ روٹی شامل ہیں۔ یہ مفکرین دلیل دیتے ہیں کہ سچائی کوئی مقررہ یا معروضی وجود نہیں ہے، بلکہ یہ طاقت کی حرکیات ہیں جو زبان، ثقافت اور ذاتی تجربات سے تشکیل پاتی ہیں۔ مابعد مصنف ایک مطلق سچائی کے وجود پذیر ہونے میں زبان اور گفتگو کی حدود و قیود کو بیان کرتے ہیں اور اس سلسلے میں مختلف نقطہ ہائے نظر اور تشریحات بیان کرتے ہیں، ان کا کام معنی کی پیچیدگیوں کو تلاش کرنا ہے۔ وہ آفاقی سچائی کے تصور کو چیلنج کرتے ہیں۔

**پس ساختیات یا ردتشکیل**

رد ساخت جسے ردتشکیل Deconstruction بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نظریہ معنی کی وحدت اور قطعیت کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ معنٰی کے مسلسل التوا کا قائل ہے۔ جیکوس دریدا (Jacques Derrida) ردتشکیل یا ردساخت کا بڑا مفکر سمجھا جاتا ہے۔ دریدا کلام میں معنی کی قطعیت کو کوئی جگہ نہیں دیتا۔ وہ آواز اور معنی کی مرکزیت کو ایک دوسرے کے متوازی پیش کر کے معنی کی مرکزیت کو ناپید گردانتا ہے کہ جو چیز ہے ہی نہیں اس کی مرکزیت کیسی؟ وہ اسے Logocentrism سے گردانتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ معنی کی مضبوط بنیاد کا تصور محال ہے، کیونکہ معنی ہمیشہ معلق رہتا ہے، اور اسی طرح سیاق و سباق بھی مکمل انداز میں متعین نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اس کے نزدیک تحریر اور تقریر میں تقریر کو فوقیت حاصل ہے کیونکہ تقریر کے دوران بولنے والا خود ذاتی حیثیت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔[21]

یعنی کسی بھی تحریر کی چاہے وہ مذہبی ہی ہو کوئی حیثیت نہیں اس کے مقابل سامنے موجود شخص کے اپنے الفاظ زیادہ اہم ہیں، دریدا کے نزدیک کوئی لغوی معنی نہیں ہوتا بلکہ معنی کا ایک استعاراتی سلسلہ ہوتا ہے۔

گوپی چند نارنگ کے بقول ردتشکیل سے مراد متن کے مطالعے کا وہ طریقہ کار ہے جس کے ذریعے متن کے کسی بھی متعین معنی کو بے دخل کیا جاسکتا ہے، اور اس کے نزدیک کوئی اصول، یا کوئی مفروضہ بھی مقدس نہیں ہے۔[22]

رولاں بارتھ کے خیال میں تخلیق ایک پیاز کی طرح ہے، معنی کی تلاش میں جس کے پرت اتارتے چلے جائیں لیکن حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے کوئی طے شدہ معنی موجود ہی نہیں اور نہ ہی کوئی متعین مابعد الطبعی نظام موجود ہے۔[23]

یعنی کسی بھی لفظ کے جو چاہے معنی متعین کیے جاسکتے ہیں اس لیے کسی مافوق الفطری ہدایات یا ان ہدایات کی روشنی میں قائم کردہ نظام کی کوئی حیثیت نہیں۔

ڈاکٹر اقبال آفاقی کہتے ہیں کہ پرانی تنقید کا نقاد ایک طرح کا مہم جو تھا جو طے شدہ مذہبی، نظریاتی اور سائنسی ایجنڈوں کی رہنمائی میں متن کے خزانوں کی تلاش کرتا۔ متن کو کھنگالتا اور پھر بے پناہ جگر سوزی سے حاصل کردہ نتائج کو مخصوص سیاق و سباق کی حدود میں رہ کر منکشف

کرتا۔اس عمل میں نقاد کی حیثیت ایک عقیدت مند سے زیادہ نہ ہوتی، جبکہ مصنف کو غوث، قطب اور ہیرو کی حیثیت دے دی جاتی۔[24]
مشعل فوکو کے نزدیک ایک عمومی تاثر یہ ہے کہ عام طور پر مصنف ہی کسی کتاب کا خالق ہوتا ہے، اور پھر یہ بھی کہ وہ دوسروں سے مختلف ہوتا ہے، جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے وہ یہ کہ مصنف تصنیف سے پہلے نہیں ہوتا۔اسے ایک بنیادی اصول قرار دے کر کسی بھی شخص کی حدود کا تعین کیا جاسکتا ہے۔[25] یعنی اس مصنف کی شخصیت صرف اس کی تصنیف کی بدولت ہے، تصنیف کے بغیر مصنف کچھ نہیں۔
فوکو مزید کہتا ہے کہ کسی بھی کتاب کی پہلی سطر سے آخری لفظ تک حدود و قیود پوری طرح واضح نہیں ہوتے، کوئی بھی کتاب دوسرے حوالوں سے مل کر کوئی نظام تشکیل دیتی ہے۔[26] یعنی کوئی بھی کتاب اس وقت تک نامکمل ہوتی ہے جب تک اس میں دوسرے حوالے موجود نہ ہوں۔

رد تشکیل (Deconstruction) یعنی دوسرے معنوں میں سے مراد یہ ہے ذہن میں الفاظ کے کچھ متعین معنوں کو مشکوک قرار دے دیا جائے اور یہ شک ذہن میں راسخ کر دیا جائے کہ جو معنی ہم سوچ رہے ہیں اس کے علاوہ بھی معنی ہو سکتے ہیں۔اس لیے کسی لفظ کے کوئی خاص معنی متعین نہیں کیے جاسکتے۔خالصتاً اگر اسلامی حوالے سے ہی اس کو دیکھا جائے قرآن وسنت، فقہ وروایت میں موجود الفاظ کو تو مانا جائے، لیکن ان الفاظ کے مخصوص معنوں کو متکلم یا کہنے والے کی اصل مراد سے آزاد کر دیا جائے۔ان لفظوں کو نئے نئے معنی دیے جائیں، قرآن وسنت کی حیثیت ایک ظاہری لفاظی کی سی رہ جائے۔تا کہ قرآن وسنت کے الفاظ کی موجودگی میں لوگ مطمئن رہیں کہ اصل متن باقی ہے۔[27]

جدید یورپی خیالات میں جس شخص کا سب سے زیادہ عمل دخل ہے وہ نٹشے ہے، نٹشے کی تصنیف The Death of the God "خدا کی موت" ہی بنیادی طور پر ہر قسم کے مہابیانیے یعنی مذہب وغیرہ کو بطور مہابیانیہ ماننے سے انکار تھا۔اسی طرح فرانسیسی فلسفی رولاں بارتھ نے بھی یہ بیان کیا کہ مصنف کی کوئی حیثیت نہیں اصل چیز الفاظ، The death of the auther کے مضمون "مصنف کی موت" جملے، اور متن کی بناوٹ ہیں، اور زبان چونکہ سماجی پیداوار ہے اس لیے مصنف محض زبان کے الفاظ کو ترتیب وترکیب ہی دیتا ہے نہ کہ اس کی نئے سرے تخلیق کرتا ہے، اور اس طرح مصنف کی کلیدی حیثیت تحریر میں سے ختم ہو گئی، اور اس طرح مطالعات بجائے مصنف کی نظر سے ساختیات کی نظر سے نظر آنے شروع ہوگئے۔اب تمام مطالب کا انحصار متن کی ساخت پر منحصر ہونے لگا، اس لیے اب جتنے پڑھنے والے ہونگے اتنے ہی الگ الگ معنی ہونگے۔اور اس طرح جلدی ہی ساختیات پسِ ساختیات میں تبدیل ہو گئی، جو کہ دریدا کی رد تشکیل کی دوسری صورت تھی، اور اس طرح رد تشکیل مابعد جدیدیت کی ایک نمائندہ تھیوری سمجھی جانے لگی۔
رد تشکیل سے مراد لفظ میں موجود معنی کی ساخت اور ذہن میں موجود معنی کی صورت کو مٹا دینا ہے۔یعنی لفظ میں پہلے سے موجود معنی کو لفظ کے ذریعے ہی خارج کر دیا جائے اور دماغ میں پہلے سے موجود پختہ تصورات کو بھی ختم کر دیا جائے تو ادراک اور اظہار، ابلاغ کی کامل تشکیل کریں گے، دریدا اپنے فلسفے کو التوائے معنی کا فلسفہ بھی کہتا ہے، اس تھیوری کے تحت لکھنے والے مصنفین کے نزدیک کوئی شے بھی فطری نہیں۔کیونکہ ہر عمل کی تشکیل سماج اور ثقافت کرتے ہیں، اس لیے زبان بھی اب ایک فطری شے نہیں رہی۔اگر زبان فطری شے ہوتی تو دوسری جبلتوں کی طرح یہ بھی اکتساب سے ماورا ہوتی اور پوری نوع انسانی کی ایک زبان ہوتی اس لیے زبان ایک ایسا مفروضہ قرار پائی جسے سماج کے مختلف طبقات کے لوگ آپس میں اپنے درمیان طے کرتے ہیں۔
ڈاکٹر منظور احمد بھی مابعد نظریات سے متاثر نظر آتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ: " کسی بات یا لفظوں کے مجموعے کو آگے منتقل کر دینے سے یہ ضروری نہیں کہ ان کے وہی معنی بھی آگے پہنچیں۔الفاظ معنوں کے بوجھ سے لمبی مسافت طے کرتے ہوئے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں اور وہ اسی درست مفہوم تک انسان کو نہیں پہنچاتے جو کہنے والے کے الفاظ کا مطلوب ہوتے ہیں"[28]
لہٰذا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصنف کے منہ سے نکلا یا قلم سے لکھا ہوا کوئی لفظ اپنے اصل معنوں میں دوسروں تک کبھی نہیں پہنچتا بلکہ

سننے والا اس سے جو مطلب نکالے وہی اس کا مطلب لیا جائے گا۔ اس طرح مذہب کا تمام بیانیہ جو کو الفاظ اور تحریروں پر مشتمل ہے اسے کسی ایک مطلب میں سمجھنے پر اصرار نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں یہ بھی کہ الفاظ جتنے زمانوں اور جتنے لوگوں سے ہوتے ہوئے پہنچے گے تو ان کے نزدیک یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنی اصل پر قائم رہ سکیں۔ ہر سننے والے نے اسے اپنے مطالب کے تحت ہی آگے بیان کیا۔ یوں ردِ تشکیل کا نظریہ بنیادی طور پر مذہب کے فلسفے ہی کو مشکوک بنانے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

**تاریخ کا خاتمہ:**

تاریخ کی اہمیت یا پھر اس کے وجود ہی سے انکار کی روش بھی جدیدیت سے شروع ہوئی، اور مابعد جدیدیت میں اسے مزید تقویت ملی، تاریخ کو عموماً جدید اور مابعد جدید مفکر مابعد الطبیعات سے ہی سے جوڑتے ہیں، اور مابعد الطبیعات ہی میں اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں، مابعد الطبیعات سے ہٹ کر زندگی میں تاریخ کی اہمیت کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ ذیل میں ایسے ہی چند مفکرین کی آرا بیان کی جاتی ہیں۔

ہیگل اس سلسلے میں کہتا ہے کہ تخلیقیت کے عمل کے ذریعے جب ذات مطلق خود کو ریاستی اداراتی صف بندی کے ذریعے مکمل کر لے گی تو تاریخ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسے ہیگل (End of History) تاریخ کا خاتمہ کہتا ہے۔ اسی پر وہ مزید کہتا ہے کہ:

"The State is the Divine Idea as it exists on Earth. We have in it, therefore, the object of History in a more definite shape than before; that in which freedom obtains objectivity, and lives in the enjoyment of this objectivity."[29]

"ریاست خدائی نظریہ ہے جیسا کہ یہ زمین پر موجود ہے۔ اس لیے ہمارے پاس اس میں تاریخ کا اعتراض پہلے سے زیادہ واضح شکل میں ہے۔ جس میں آزادی معروضیت حاصل کرتی ہے، اور اس معروضیت کے لطف میں زندگی گزارتی ہے"

اب چونکہ انسانیت و تہذیب اپنے معراج کو پہنچ چکی ہے تو اس کے متعلق بھی ہیگل نے پیشن گوئی کی تھی کہ اس معراج کا نمائندہ امریکہ ہوگا، اور وہ درست ثابت ہوئی۔ اسی طرح "Huntington" کی کتاب [30]"The Clash of civilizations" (تہذیبوں کا تصادم) بھی اسی پس منظر میں لکھی گئی، مصنف کے نزدیک چونکہ یہ تہذیبوں کے تصادم کا دور ہے اور مغربی فلسفہ اور طرز زندگی، سائنس اور ٹیکنالوجی تاریخ کے بہترین دور کے نمائندے ہیں اسی لیے وہی سب سے زیادہ غالب تہذیب ہے، اور جو اسے قبول کرنے سے انکار کرے اُس تہذیب سے تصادم لازم ہے۔

اسی طرح مابعد مفکر دریدا تاریخیت کے تصور کی مکمل نفی کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ تاریخ بھی مابعد الطبیعات کے مجموعی پلان کا حصہ ہے، جس کے مطابق تاریخ سیدھی لکیر پر چلنے کی پابند ہے، یعنی اگر تاریخ کا یہ تصور درست مان لیا جائے تو سارا مذہبی اور مابعد الطبیعاتی نظام بے وقعت ہو جائے۔

اسی طرح ایک اور مابعد مفکر مشعل فوکو کے نزدیک بھی تاریخ ایک غیر تسلسل، انتشار اور اتفاقی حادثات کا نتیجہ ہے، یہ کسی منصوبے یا ترقی کی وجہ سے نہیں ہے۔[31]

مابعد جدیدیت کے نزدیک تاریخ میں سچائی کا کوئی وجود نہیں۔ اس لیے جب کوئی مؤرخ لکھتا ہے تو اس کے حالات و واقعات میں اپنے تعصّبات اور سیاسی اغراض کی وجہ سے بہت کچھ صرف نظر کر دیتا ہے۔ اصل تاریخ وہ ہے جو ان گنت غیر بیان شدہ واقعات کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ تاریخ میں سے ہر اس چیز کو باہر نکال دیا جاتا ہے جو معاشرے کی شناخت کو مجروح کرے۔[32]

فوکو یاما اپنی کتاب "The End of History and the Last Man" میں بیان کرتا ہے کہ تاریخ کے خاتمے کا مطلب جنگوں اور خونیں انقلابوں کا خاتمہ ہے۔ مقاصد پر اتفاق رائے کے بعد انسان کے پاس جنگ و جدال کا کوئی سبب نہیں ہوگا۔ انسان اپنی ضروریات کو معاشی جد و جہد کے ذریعے پورا کرے گا۔ یعنی اگر یوں کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ انسان واپس اس حیوانی منزل پر چلا

جائے جب کسی خونی جنگ کے نتیجے میں تاریخ کا آغاز نہیں ہوا تھا" اس کے نزدیک اس آخری آدمی کی زندگی ایک پالتو کتے کی طرح ہوگی جو بے فکری کے ساتھ خوب جی بھر کے کھائے اور پھر سردیوں کے سورج کی دھوپ میں خوب نیند کے مزے لے۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں اگر کچھ دوسرے کتوں پر ظلم ہو رہا ہو تو یہ اس کے لیے پریشان کن نہیں ہوگا، کیونکہ وہ اپنی موجودہ صورتحال سے بالکل مطمئن ہوگا۔[33]

یعنی فوکو نے ایک ہی وقت میں تاریخ کے خاتمے کو انسانیت کی بقاء کے لیے ضروری بھی قرار دیا ہے اور دوسری طرف وہ اس کے بعد انسان کی حالت کو ایک جانور کی حالت سے بھی تشبیہ دیتا ہے۔ یعنی وہ خود اس بات پر قائل نہیں ہو رہا کہ تاریخ کے خاتمے کا نظریہ انسان کے لیے مفید ہے یا غیر مفید۔

**مابعد جدیدیت اور اخلاقیات**

کانٹ سے قبل اخلاقیات کے دو نقطہ نظر عام تھے، پہلا مذہبی نقطہ نظر تھا کہ اخلاقیات ارادہ الٰہی کے سامنے سر نیاز خم کر دینے کا نام اور زندگی کا مقصد ارادہ الٰہی کی اتباع اور رضائے الٰہی کا حصول ہے دوسرا نقطہ نظر فطری قوانین کی پیروی کا تھا کہ اخلاقی و سیاسی اقدار کو فطری قوانین کا پابند اور تابع ہونا چاہیے۔ انسانی معاشرت و اجتماعیت میں اخلاقی و سیاسی قوانین طبیعی قوانین ہی کی طرح کارفرما ہیں۔ ان قوانین کا ادراک عقل کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ عیسائی حضرات اس میں اس طرح موافقت پیدا کرتے ہیں کہ قانون بھی خدا کا ہے اور فطرت بھی اسی کی تخلیق ہے، لہٰذا فطرت کی پیروی دراصل خدا ہی کی اتباع ہے۔ اس کے برعکس کانٹ کے نزدیک اخلاقیات کا منبع ارادہ تو ہو سکتا ہے لیکن وہ ارادہ خداوندی نہیں بلکہ ارادہ انسانی ہے اور اخلاقیات ارادہ انسانی کی اتباع کا نام ہے، خود کو کسی اور کے ارادے کا پابند کرنا غیر اخلاقی امر، بدترین شر اور انسانی خود مختاری کا سودا ہے۔

مابعد جدیدیت میں جہاں مہابیانیہ کے انکار کا نظریہ وجود پذیر ہوا وہیں ہر طرح کی آزادی بھی در آئی۔ یہاں کسی کو کسی روک ٹوک کی اجازت نہیں۔ ہر شخص کو انفرادی حیثیت میں ہر طرح کے خیالات میں آزادی حاصل ہے، وہ جو چاہے سوچ سکتا ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے۔ کسی شخص یا طبقے کو کسی رویے، عقیدے یا نظریے کو رد کرنے یا ناپسند کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مرد، مرد سے یا عورت، عورت سے شادی کرنا چاہے تو اسے اس کی مکمل آزادی ہے۔ چاہے اپنے آپ سے شادی کر لے۔ اسی طرح اگر کسی کو برہنہ رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے تو اس کا ذاتی اختیار ہے کہ وہ برہنہ رہے۔ ان معاملات میں کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ یعنی کوئی اخلاقی یا غیر اخلاقی قدر جو کسی شخص کو اپنی ذات میں پسند ہو، اگر اس سے کسی دوسرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو ہر شخص آزاد ہے کہ وہ جو چاہے کرے، ریاست اس میں مداخلت نہیں کرے گے۔

ایک مسلم مصنف لکھتے ہیں کہ اگر ایک فرد اپنی عمر کے کسی حصے میں اپنے ہر جز کو بدل کر بھی وہی فرد رہ سکتا ہے تو کوئی تہذیب اپنی روایتوں میں تبدیلیوں کے باوجود کیوں اپنا تشخص برقرار نہیں رکھ سکتی۔[34]

اسی طرح تحریک نسواں کی تھیوری نے بھی کئی اخلاقی حدود کو بھی پامال کیا۔ لیکن ٹیری ایگلٹن کہتے ہیں کہ " حقوق نسواں کی تھیوری نے نہ صرف ان شرعی حدود و ضوابط کا پردہ چاک کیا جنہوں نے تخلیقی عمل میں خواتین کا داخلہ ممنوع کیا ہوا تھا بلکہ بہت سے ایسے راستے پیدا کیے جن پر چل کر یہ ممکن ہوا کہ خواتین اپنے حقوق سے آگاہ ہو کر ان کو منوائیں۔ خواتین نے نہ صرف قرونِ وسطیٰ بلکہ رینے ساں کی تحریک میں بھی اپنی عظمت کا لوہا منوایا۔[35]

اسی طرح کچھ مفکرین نے بھی خواتین کی تحریک میں اپنا کردار ادا کیا ان میں سر فہرست جولیا کرسیٹیوا، لوسی ارگیرے اور سکوس جیسی فرانسیسی خواتین بھی شامل ہیں، انہیں خواتین نے علم اللسانیات کے شعبے میں دریدا کی بھی مدد کی جس کی وجہ سے دریدا علم اللسانیات میں نئے نظریات پیش کرنے میں کامیاب ہوا۔

حقوق نسواں کی پہلی لہر 1970 میں ظاہر ہوئی اور اس کے بعد 1980 میں ایک اس سے زیادہ شدید لہریں آئیں، اسی دوسری

لہر کا بنیادی مقصد خواتین کے معاشی اور سیاسی حقوق کے ساتھ ساتھ ان کے جنسی حقوق بھی ان کو دلانا تھا۔

مشعل فوکو کے نزدیک ہماری اس دنیا میں زنانہ اور مردانہ اعمال کے فطری ہونے میں مغالطہ پایا جاتا ہے۔اس کے خیال میں یہ بات حقیقت کے متضاد ہے کہ عورت اور مرد کے کردار کا تعین ان کے وجود کی ساخت میں پوشیدہ ہے۔بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا تعین خاص طور پر سماجی اور ثقافتی اعمال کرتے ہیں۔زراعت کے فن کی ایجاد نے نجی ملکیت کے ذریعے سے جس تہذیب و تمدن کی تشکیل کی اس نے غلامی اور شادی کے رواجوں کو جنم دیا۔جس سے طاقت کے تمام تر مراکز مادرانہ سے پدرانہ سماجی ساخت میں منتقل ہو گئے۔

چونکہ مذہب کو سماجی تاریخ کے ہر عہد میں ایک بڑے ادارے کی حیثیت حاصل رہی ہے اور اس ادارے پر قبضہ بھی مردانہ حاکمیت کا ہی رہا ہے اس لیے ان دونوں اصناف کے کردار کا تعین بھی یک طرفہ اور مردانہ ہے۔مشل فوکو کی خاص طور پر دو کتابیں "جنسیات کی تاریخ" اور "علم /طاقت" نے اس حوالے سے بہت شہرت پائی، جس میں اس نے صنفیت کے حوالے سے بہت بڑے سوالات اٹھائے کہ انسان کا طبقات اور درجات میں تقسیم ہونا اور یہ خیال کہ عورت ناقص العقل ہے، یہ بات فطری نہیں بلکہ اس کی تشکیل ثقافت کرتی، جس کو بعد میں سماج کے ہاتھوں ترقی ملتی ہے، جو فطرت کے نام پر مسلط کر دی جاتی ہے۔فطرت کبھی بھی مرد و خواتین میں فرق نہیں کرتی یہ معاشرہ ہی ہے جو صنفیت میں امتیاز پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے چونکہ ہمارے معاشروں میں مردانہ غلبہ ہوتا ہے اس لیے عورت کو کم تر اور دوسرے درجے پر رکھا جاتا ہے۔اس طرح مغرب میں اسی طرح کے مصنفین سے فیض یاب ہو کر ہم دیکھتے ہیں کہ حقوق نسواں کی تحریک پر اوان چڑھتی ہے اور مغرب کے سماج سے اپنے بہت سے حقوق منواتی ہے۔

## شبیہی دنیا

شبیہی دنیا مابعد جدید دور کی ایک ایسی صورتحال ہے کہ جس میں انسان اب ایک مجبورِ محض ہونے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس میں انسان کی پسند ناپسند، اس کی ضرورت و ترجیحات اس کی تعلیم و تفریح، اس کے خوش ہونے اور اداس ہونے اور حتیٰ کہ اس کی محبت اور نفرت، ان سب کے پیمانے اب سکرین کی دنیا طے کرتی ہے۔

سکرین کی یہ دنیا اس کے گھر کے ہر ہر کونے میں موبائل، ایل سی ڈی، اور ٹی وی کی شکل میں۔اور اس کی باہر کی دنیا میں چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی جہازی سائز اشتہاری سکرینیں جو کہ ہر روڈ اور چوک میں نظر آتی ہیں، اسی طرح اس کی تعلیم کی یا دفتر کی دنیا میں بھی کمپیوٹر، لیب ٹاپ، موبائل اور ان پر موجود جدید جدید سافٹ وئیرز کی شکل میں ہر جگہ موجود ہے۔ان سب چیزوں میں یعنی ویڈیوز اور اشتہارات وغیرہ کے اندر اشتہا آمیز تصویروں کی بھرمار اب انسان کی تمام ترجیحات و ترغیبات، اس کی پسند ناپسند اور اس کے موڈ کا فیصلہ کرتے ہیں۔لیب ٹاپ اور موبائل پر موجود طرح طرح کے سافٹ وئیرز انسان کو ہر آسائش بہم پہنچانے اور اس کے وقت اور سرمائے کو اپنی مرضی سے استعمال کرنے پر قادر ہو چلا ہے۔گوگل نے آ کے اس کے لیے کسی بھی چیز کی تلاش اور مواد تک آسانی فراہم کی، فیس بک نے ہر شخص کے ہزاروں اَن دیکھے دوست بنا کے اس کا ذوق اور مزاج طے کر دیا۔یوٹیوب نے اس کے لیے دنیا جہان کی فلمیں، ڈرامے، تعلیمی، تفریحی غرض ہر طرح کی ویڈیو مہیا کر دی۔انسٹا گرام اور ٹیوٹر نے اسے ہر وقت حالات کے مطابق کچھ نہ کچھ دیکھنے یا کہنے کی جگہ مہیا کر دی۔اور ٹک ٹاک نے تو ایک عجیب ہی منظر نامہ تخلیق کر ڈالا کہ جس میں انسان مختصر سی چند سیکنڈ کی ویڈیوز میں مبحوط کر رہ جاتا ہے۔اور سیکنڈوں کی وہ ہزاروں ویڈیوز دیکھ ڈالتا ہے، اور ان سب میں کوئی ایک مضمون موجود نہیں ہوتا، بلکہ جس طرح کی ویڈیوز میں آپ منہمک نظر آئیں گے، ٹک ٹاک اسی طرح کی تمام ویڈیوز دیکھانا شروع کر دے گا اور آپ وہی دیکھتے چلے جاتے ہیں۔اور آجکل ایک اور جدید ایپ آئی ہے جسے سنیپ چیٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے اور اس پر انسان اپنی ہر ہر مصروفیت کی سٹیک بنا کر بھیجتا ہے۔مثال کے طور پر اگر کوئی منفرد کھانا کھا رہا ہے یا کوئی باہر گیا اور اسے کچھ منفرد نظر آیا، کسی نے نئے کپڑے یا نئے جوتے پہنے یا کچھ بھی ایسا جسے کر کے اسے خود پر فخر محسوس ہو اسے وہ لازمی سٹیک کی صورت میں سنیپ چیٹ پر تصویری یا چند سیکنڈ کی ویڈیو کی شکل میں ضرور ڈالے گا، اور یوں ہر انسان خود

پسندی کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے، اور جب وہ دوسروں کی اس طرح کی چیزیں دیکھتا ہے تو ردِ عمل میں خود بھی ویسا ہی یا اس سے بڑھ کر منفرد کرنے کے دیکھانے کی تگ و دو میں لگ جاتا ہے۔

یہ سب چیزیں کیا ہے یہ سب چیزیں وہ ہیں جو انسان کے اندر سے حقیقی انسان نکال کر اس میں ایک شبیہی انسان ٹھونس ٹھونس کر بھر رہی ہیں۔ یہ وہ انسان ہے جس کی اپنی کوئی پسند ناپسند مرضی یا اختیار ختم ہوتا جارہا ہے، اب جو کچھ سکرین اسے دیکھائے گی، وہ انہیں میں سے کسی نہ کسی سے متاثر ہوگا۔ اور اسے ہی اپنی پسند ناپسند کا محور بنائے گا۔

نیل پوسٹ مین کی کتاب ٹیکنوپولی جو کہ موجودہ دور میں ٹیکنالوجی کے بے دریغ استعمال میں انسان کے اپنی شناخت کھو جانے کا بہت گہرائی سے جائزہ لیتی ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو 11 ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ٹیکنوپولی اصل میں دو الفاظ ٹیکنالوجی اور منوپلی کو جوڑ کر بنایا گیا۔ منوپلی کا مطلب جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ کسی چیز کی اجارہ داری قائم کرنے کو منوپلی کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے۔ تو مصنف نے موجودہ دور میں ٹیکنالوجی کے ایسے بے دریغ استعمال اور اس کا اپنی حدود سے باہر نکل کر خود انسان کو اپنے ہی آگے بے بس کر دینے کی وجہ سے ٹیکنوپولی کا نام دیا ہے۔ یہ کتاب بہت بہترین کتاب ہے، اس کے ہر چیپٹر میں مصنف نے آغاز تب سے کیا ہے جب ٹیکنالوجی کا کوئی وجود نہیں تھا، اور بعد میں آہستہ آہستہ اس فیلڈ میں جیسے جیسے ٹیکنالوجی آتی گئی، ویسے ویسے انسان کے لیے مسائل میں اضافہ ہوتا گیا۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ٹیکنالوجی کی وجہ سے انسان کو جتنا عروج، آسانی اور طاقت میسر آئی ہے اس کا کسی دوسری چیز سے کوئی موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس کتاب کے مصنف نے اس بات سے انکار کرتے ہوئے ٹیکنالوجی کی وجہ سے انسان کو پیش آمدہ مسائل کو زیادہ بڑا گردانا ہے، وہ کتاب کے شروع ہی میں پال گڈ مین کا ایک جملہ لکھ کے اپنی کتاب کا آغاز کرتے ہیں، وہ جملہ یہ ہے۔ Whether on not it draws on new scientific research, technology is a brach of moral philosophy, not of science. یعنی ٹیکنالوجی اخلاقیات کا حصہ ہے نہ کہ سائنس کا۔

یعنی ہم جو ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہیں اس کے اخلاقی اثرات نکلتے ہیں۔ اور اسی طرح جیسے یہ سائنس کا مسئلہ نہیں ہے ویسے ہی دین کا بھی مسئلہ نہیں ہے مثال کے طور پر الہامی کتابوں میں یہ نہیں بتایا جاتا ہے کہ روٹی پکانے کے لیے کون سے آلات استعمال کرنے ہیں اور کون سے نہیں، ہاں دین صرف اس کے اخلاقی پہلو پر بات کرے گا۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ٹیکنالوجی بہت فائدہ دیتی ہے، اس نے ہماری زندگیاں آسان بنادی ہیں، ہمارے لیے بے شمار سہولتیں فراہم کر دی ہیں، ہم اسی ٹیکنالوجی کی چیزوں ہی میں دن رات جیتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اس کی افادیت تو پورے طریقے سے معلوم ہے لیکن اس کے برے اثرات سے ہم ناواقف ہیں۔ اس کی مثال دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ جیسے سمندر کے اندر ایک مچھلی نے دوسری مچھلی سے پوچھا کہ میں نے آج باہر کسی سے پانی نام کی کسی چیز کا سنا ہے، تو یہ پانی کیا ہوتا ہے، بلکل اسی طرح یہ ٹیکنالوجی بھی ایک دنیا ہے جس میں ہم جیتے ہیں، اور یہ دنیا ارد گرد کے پورے ماحول کو یرغمال بنالیتی ہے۔ اس سے باہر کسی کے لیے اب دیکھنا ممکن ہی نہیں، ہماری دسترس میں موجود ہر دنیا اب ٹیکنالوجی ہی کی دنیا ہے۔ نیل پوسٹ مین کہتا ہے، کہ ;Every technology is both a burden and a blessing اس کے خیال میں ہر ٹیکنالوجی ایک بوجھ بھی ہے اور باعث آسائش بھی۔ لیکن ہم دجال کی طرح اس وقت صرف اپنی ایک آنکھ رکھتے ہیں جو کہ صرف اس کے فوائد دیکھ رہی ہے، اس کے نقصانات نہیں دیکھ رہی، آج کے دور میں کہیں بھی اس پر تنقید کرنا آسان نہیں ہے، لوگوں کو یہ ٹیکنالوجی اب ایسے لگتی ہے کہ جیسے یہ بلکل فطری ہے، جیسے ہوا، پانی فطری ہیں، تو گویا اب اس ٹیکنالوجی کو استعمال نہ کرنا ناشکری کے ضمن میں آتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی یہ کہ ان ٹیکنالوجیز کی بنیادی بناوٹ میں ایسے پروگرامز ہیں جنہیں آپ نکال نہیں سکتے، مثال کے طور پر ٹی وی کے اندر انٹرٹینمنٹ کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح موبائل کے اندر سے وہ بنیادی عنصر ہی نہیں نکالا جاسکتا جو کہ فحاشی یا نقصان دہ چیزوں کو دیکھانے سے ہمیشہ کے لیے

روک سکے۔[36]

اسی طرح یہ بھی کہ اب اچھی تعلیم کا تصور بھی تبدیل ہو گیا ہے، اب اچھے ادارے وہ ہیں جس کے ہر کلاس روم میں سکرین لگی ہوئی ہے، زیادہ جدید اداروں میں اب ہر بچے کے پاس ٹیبلٹ یا لیب ٹاپ بھی ہو گا، وہاں انہیں اسائنمنٹ دی جائیں گے کہ آپ فلاں ویڈیو دیکھ لیں آپ فلاں ویب سائیڈ دیکھ لیں، آپ سامنے سکرین میں دیکھیں، اس لیے جب کسی کی تعلیم سکرین کے ذریعے ہو رہی ہو تو پھر اس کے لیے کتاب اہم نہیں ہو گی۔

اب یہ تصور کہ آدمی اہم ہے اس کے مقابلے میں اب کمپیوٹر یا ٹیکنالوجی اہم گردانی جائے گے۔ اور یہ کمی ہمارے اداروں میں دیکھی جاسکتی ہے کہ جہاں سکرین یا انٹر ٹینمنٹ نہ ہو وہاں بچوں کی توجہ حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ کہ بچوں کو گھر میں ٹی وی موبائل اور سب کچھ مل رہا ہے اس لیے بچے اب سکول میں بھی ایسی چیزوں سے ہی متاثر ہو کر کچھ سیکھ پاتے ہیں، بچوں کو اب ٹیچر نہیں بلکہ ایک انٹرٹینر چاہیے، جو انہیں کلاس میں لطیفے، قصے، سائنس ایڈونچر وغیرہ سنا کے انٹرٹین کرے۔

خوشی کے تصورات تبدیل کیے جارہے ہیں اب خوشی کے موقوں پر میڈیا جس طرح خوشی یا غمی مناتا ہے اسی طرح معاشرے میں رائج ہوتا جارہا ہے۔ آخر میں وہ سوال کرتا ہے کہ یہ سب کچھ تصورِ مذہب اور تصور خدا میں کیا تبدیلیاں لارہا ہے اس کی جانب متوجہ ہونے کی اشد ضرورت ہے۔[37]

اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ان تمام باتوں کو ان کی انتہاؤں میں رکھ کر نہ بھی مانا جائے تو پھر بھی ان کو مکمل طور پر نظر انداز کر دینا ممکن نہیں، سکرین کے اثرات ایسے مضر تو ہیں جسے ہم آسانی سے محسوس نہیں کر سکتے، لیکن سکرین کے ارتقاء سے پہلے کا دور دیکھنے والے افراد اس فرق اور اس کے مضمرات کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، اور یہ تمام تر شاخصانہ مابعد جدیدیت ہی کا ہے۔ اس سکرین نے مذہب پر بھی اپنے اثرات ڈالے ہیں، آج سے کچھ عرصہ پہلے تک کچھ مذہبی گروہوں کی جانب سے سکرین کو حرام قرار دے کر اسے توڑ ڈالنے اور تصویر بنوانے کی ممانعت بلکہ مذہبی طور پر حرام قرار دے دیا گیا تھا۔ لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی حوالے سے سب سے بڑا ٹی وی چینل ہی اب اسی گروپ کا ہے جس نے ٹی وی توڑنے کا فتویٰ جاری کیا تھا۔ اسی طرح مذہب جو سادگی، انکساری، عاجزی، اور نفس کشی سکھاتا ہے، سکرین پر آنے سے یہ سب کچھ اب جاتا رہا ہے، اب سکرین پر ہر جگہ یہی مدِ نظر ہوتا ہے کہ اچھے سے اچھا کیسے نظر آیا جائے اور ہمارا بیک گراؤنڈ کیسا عالیشان ہو جو دوسرے کو متاثر کرے، روشنی اور میک اپ ایسا ہو جو چہروں کو اصل سے مختلف دیکھائے، یہ سب تبدیلیاں مابعد جدیدیت ہی کی مرہونِ منت ہیں۔

پہلے کسی کسی وقت قرآن کی آیات یا احادیث سنا کرتے تھے اور اسے سن کے ایک باایمان آدمی کا سماء بندھ جاتا تھا وہ کچھ دیر کے لیے انہیں الفاظ اور مناظر میں گم رہتا ہے تھا، اب کیا ہے کہ قرآنی آیات اور احادیث کثرت میں سامنے آتی جارہی ہیں اور جب ہمارا موڈ نہیں ہے تو ہم اسے نظر انداز کرتے ہوئے اوپر کرتے چلے جاتے ہیں، اور اگر سنتے بھی ہیں تو اس کا اثر کچھ دیر بھی نہیں ٹھہرتا کیونکہ اس وقت تک ہم اگلی پوسٹ تک پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ تو اس سے یہ لگتا ہے کہ اس سکرین کی ایسی بے لگام عادت نے ہمیں مذہب کے معاملے میں بھی متاثر کیا ہے۔ نہیں معلوم کے مستقبل میں یہ ٹیکنالوجی انسان کو کہاں سے کہاں لے جائے جہاں سے خدا اور مذہب اس کے وہم و گمان میں بھی موجود نہ ہو۔ لہٰذا اس کے مضر اثرات سے بچاؤ کی تدبیریں اور اسکے بارے میں آگاہی فراہم کی اشد ضرورت ہے۔

## آرٹیفشل انٹیلیجنس

آرٹیفشل انٹیلیجنس موجودہ دور کی ایک ایسی صورتحال ہے کہ جس سے انسان اپنی اصل، پرانی اور مرکزی حیثیت کھو دے گا۔ آرٹیفیشل انٹیلیجنس (AI) ایک ایسا ترقی کرتا ہوا علم ہے جو کمپیوٹر سسٹمز کو مصنوعی عقلمندی سے چلانے کی طاقت رکھتا ہے۔ آج کل اس کا استعمال بہت سے شعبوں میں ہو رہا ہے، جیسے طبّی علوم، صنعت اور تجارت وغیرہ۔ آہستہ آہستہ تمام بڑی بڑی کمپنیاں اپنے ہاں آرٹیفشل

انٹیلیجنس کو انسانوں کے ساتھ تبدیل کر رہی ہیں، اب انسانوں کی جگہ فیکٹریوں میں ربوٹ کام کرتے ہیں۔ دفاتر میں تو کمپیوٹر پر پہلے ہی سے سب کچھ منتقل ہے، اب کمپیوٹرز کو آرٹیفشل انٹیلجنس پر منتقل کیا جارہا ہے جو کہ سافٹ ویئرز کے ذریعے خود کار طریقے سے تمام امور سرانجام دیتے ہیں، اور اب انسان صرف نگرانی کے لیے متعین ہیں، مثال کے طور پر جیسے دنیا میں موجود گوگل کے بڑے بڑے ڈیٹا سینٹرز وغیرہ۔ جیسے ہر ٹیکنالوجی اپنے ساتھ اس کے مضر اثرات رکھتی ہے ویسے ہی آرٹیفیشل انٹیلیجنس سے بھی خطرات ترین اثرات کا اندیشہ موجود ہے۔

ایک خدشہ یہ ہے کہ AI کی طاقت اور طریقہ کار بڑھنے سے یہ انسانی تخلیق سے بہتر اور زیادہ قوی ہو سکتی ہے۔ اور اگر اسے کنٹرول نہ کیا جائے یا اس میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے، تو یہ انسانی بقاء کے لیے خطرہ پیدا کر سکتی ہے۔

دوسرا خدشہ یہ ہے کہ AI انسانی لیبر کے تصور کو تبدیل کر رہی ہے، جبکہ یہ مستقبل میں انسانوں کی ضرورت کو ہی ختم کر سکتی ہے، اور اگر AI انسانوں کے لئے ملازمتیں کم کرتا ہے اور بے روزگاری پیدا کرتا ہے، تو اس سے معاشی سکون برباد ہو سکتا ہے۔

آرٹیفشل انٹیلجنس ہی کا ایک شاخصانہ Chat GBT بھی ہے۔ یہ ایسا سافٹ ویئر ہے جو کہ انٹرنیٹ سے منسلک ہونے کے بعد کسی بھی قسم کے سوال کو سمجھنے اور اس سوال کا جواب خود سے تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس سافٹ ویئر سے آپ کچھ بھی پوچھیں وہ آپ کو اس کا جواب ایک انسان کی طرح دے گا۔ مثلاً اگر اسے پوچھا جائے کہ آپ کے خیال میں مذہب یا خدا کی زندگیوں میں کوئی اہمیت ہونی چاہیے یا نہیں۔ تو اس نے جواب دیا کہ "مذہب ہر شخص کا ایک انفرادی معاملہ ہے، اس میں کسی کو بھی اس پر مجبور نہیں کیا جانا چاہیے کہ وہ لازمی خدا کو مانے، مذہب اور خدا صرف ہر فرد کے انفرادی خیالات، اس کے اعتقادات، اس کی تربیت، اور تعلیم پر منحصر ہے"

اس کے بے دریغ استعمال کے نتیجے میں انسان کاہل اور سست ہو جائیں گے، انسان اپنا دماغ استعمال کرنے کے معاملے میں تمام تر انحصار ان چیزوں پر کرے گا، اُسے اِن سے جو معلومات ملیں گی وہ انہیں ہی مستند سمجھے گا۔ اسی طرح اگر مذہب کے متعلق بھی انسان کا انحصار انہیں چیزوں پر منتقل ہو گیا تو اس کے کیا نتائج نکلیں گے یہ ایک الگ موضوع ہے۔

اس وقت بنی نوانسان اور خصوصاً مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ AI کے بے دریغ استعمال کے متعلق اور اس کے نقصانات کے متعلق لوگوں میں آگاہی پیدا کریں، تاکہ اگر یہ کسی کے لیے ضروری بھی ہو تو اسے کچھ حدود و قیود کا پابند بنانا چاہیے۔ اس کے لئے، قوانین اور اصول بنانے کی ضرورت ہے جو AI کو انسانی اقدامات اور اخلاقیات کے مطابق کام کرنے کی ضرورت پر زور دیں۔

بہت سے ماہرین کہتے ہیں کہ AI کی ترقی ہماری زندگیوں کو بہتر بنا سکتی ہے، لیکن ہمیں اس کی خطرناکیوں کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے استعمال کو محدود اور نگرانی کے ساتھ کرنا ہماری زندگیوں کے لئے مثبت اثرات پیدا کر سکتا ہے اور مذہب اور انسانی بقاء کو یقینی بنا سکتا ہے۔ مابعد جدیدیت کی یہ بھی ایک ایسی صورتحال ہے کہ جس سے ہر معاشرہ اس وقت گزر رہا ہے۔ ٹیکنالوجی اور سکرین کی طرح ہم اس میں بھی اس طرح گم ہوتے جارہے کہ انسان اپنی ذاتی استعداد بڑھانے کے بجائے اب اس ٹیکنالوجی پر انحصار کرنا شروع کر دے گا۔ اور جو بھی جھوٹ سچ وہ بتائے اس کو بغیر تصدیق کے قبول کرنے کو تیار ہو گا۔ اور اس کی Authentification پر اندھا اعتماد بڑھتا جارہا ہے۔ آرٹیفشل انٹیلجنس ایک مصنوعی ذہانت ہے جس میں عقل، احساسات، جذبات اور حسیات نہیں ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ اس کا مذہب کے بارے میں بھی ہر سچ جھوٹ دوسروں کو متاثر کر سکتا ہے۔

**خدا کی موت (معاذاللہ) کے بعد انسان کی موت**

خدا کی موت کے بیانیے کا آغاز اصل میں مابعد الطبعی سچائیوں کو عقل کے ذریعے جاننے کی کوششوں کے نتیجے کے طور پر شروع ہوا۔ اور پھر یوں آہستہ آہستہ پہلے آفاقی سچائیوں سے انکار اور پھر آخر کار خدا ہی کے وجود سے انکار پر منتج ہوا، اس کے نتیجے میں Humanism کا تصور وجود پذیر ہوا، جسے بعد میں مذہب جیسی حیثیت حاصل ہو گئی۔ بعد ازاں "خدا کی موت کو The Death of

the God کے نام سے باقاعدہ طور پر نطشے نے پیش کیا۔ایک مغربی مفکر لکھتا ہے کہ :

"The great nineteenth and early twentieth century experience of the DEATH OF GOD led either to a some of absence or a new individual of man and human Power.[38]

یعنی انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں "خدا کی موت" کے عظیم تجربے نے یا تو کسی کی بھی غیر موجودگی یا انسان اور انسانی طاقت کے ایک نئے فرد کو جنم دیا۔

جیسا کہ انیسویں صدی میں نیطشے نے کہا کہ (نعوذ باللہ) خدا مر گیا ہے، تو اس کے جواب میں مابعد جدید مفکرین میں سے کچھ نے کہا کہ نہیں اب تو انسان بھی مر گیا ہے۔

"Post modernism would then be understood as the DEATH OF MAN or of humanism and its faith in human powr and transcendence, as well as of God; The end of all attampts to discover ultimate "Origins" or a certain method, or to revolutionize human consciousness."[39]

"مابعد جدیدیت کو پھر انسان کی موت یا انسانیت کی موت اور انسانی اور ماورائی طاقت کے ساتھ ساتھ خدا پر اس کے ایمان کی بھی موت سمجھا جائے گا۔آخر کار آخری "سچ" یا کسی خاص طریقہ کو دریافت کرنے یا انسانی شعور میں انقلاب لانے کے لیے تمام کوششوں کا خاتمہ"

مابعد جدیدیت نے خدا کے انکار سے آگے بڑھ کے خود انسان کی اتھارٹی کو ہی چیلنج کر دیا۔گویا مابعد جدیدیت کا اب یہ کہنا ہے کہ اس دور میں انسان اس نہج پر پہنچ چکا ہے کہ اب وہ اپنے آپ پر خود قادر نہیں بلکہ اب یہ میڈیائی اور تصویراتی دور اس سے جو کروانا چاہے انسان وہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے، مثال کے طور پر جیسے کہ میڈیا یعنی ٹی وی، اور سوشل میڈیا یعنی کہ فیس بک انسٹا گرام، یوٹیوب وغیرہ پر اشتہارات کی بھرمار اور اگر انسان ان چیزوں کے سحر سے باہر نکل کے روڈ پر نکلے تو جگہ جگہ بڑے بڑے دیو ہیکل بورڈز، روڈز کے درمیان میں موجود الیکٹریکل سکرینیں، اور دیگر طرح کے اشتہارات، یعنی ہر جگہ جہاں انسان کے نظر پڑے وہاں انسانوں کو ترغیب دیلانے کے لیے اس کی کمزوریوں کے مطابق اشہارات کا انبار، اور تقریباً ہر اشتہار میں صنفِ نازک کی موجودگی تاکہ انسان اس اشتہار کو کچھ دیر غور سے دیکھ سکے اور اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اشیاء بنانے والی کمپنیاں اسے اپنی پروڈکٹ کی جانب راغب کر سکیں۔

اسی طرح ایسی تمام جگہیں جہاں انسان کام کیا کرتا تھا وہاں اب آہستہ آہستہ مشینیں، سوفٹ ویئر اور ربوٹ انسان کی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ آرٹیفشل انٹیلیجنس کے بعد اب عقل بھی انسان کی دسترس سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔آرٹیفشل انٹیلیجنس کے بعد اب انسان سے زیادہ ان مشینوں اور سافٹ ویئرز پر بھروسہ کیا جانے لگا ہے جو کہ آرٹیفشل انٹیلیجنس کا شاخصانہ ہیں۔یہ سب کچھ کیا ہے ؟ مابعد جدیدیت کے نزدیک اصل میں خدا کی موت (معاذاللہ) کے بعد اب انسان کی بھی موت کی جانب ایک سفر ہے۔اس حد تک تو بات کچھ درست سمجھی جا سکتی ہے کہ ٹیکنالوجی کی اس بہتات اور مصنوعی ذہانت نے انسان کو اب زنگ آلود کر دیا ہے۔اس میں خدا اور مذہب کے بارے میں اب وہ پہلے کی سی چستی پھرتی اور جرات موجود نہیں۔افغانستان آخری ملک تھا جہاں خالص مذہبی بنیادوں پر سینکڑوں سال پہلے کے اسلام کے کو نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔یہ الگ بحث ہے کہ اِس کی اس دور میں ضرورت بھی تھی یا نہیں، کیونکہ آج کل حالات وہ نہیں جو چودہ سو سال پہلے تھے، حالات کے مطابق اجتہاد کے ذریعے بہت کچھ تبدیل ہو چکا۔لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اب مجموعی طور پر اسلام ایک برائے نام اور بے جان سی قوت ہے جس کا دنیا میں کوئی وجود نظر نہیں آتا، اسلامی دنیا جدید دنیا کے آگے مغلوب نظر آتی ہے۔

اور ان حالات میں مابعد جدیدیت کے نظریات مسلم معاشروں کے لیے کسی زہر قاتل سے کم حیثیت نہیں رکھتے۔

**نتیجہ:**

مابعد جدیدیت کے اس پر فتن دور میں اسلامی دنیا اور اسلامی ثقافت و تہذیب اور مذہب کے اساسی نظریات کو جس طرح جدیدیت اور پھر اس کے بعد مابعد جدیدیت کے افکار و نظریات متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کے اثرات ہم اپنی نسل کے اندر اپنے ارد گرد ہی آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے تعلیمی ادارے مکمل طور پر مغربی نظریہ علم (Epistimology) کی بنیاد پر قائم ہیں، وہاں تعلیمی سلیبس سے لیکر تعلیمی طریقہ کار، تعلیم دینے کا ماحول، تعلیم دینے والوں کی علمی قابلیت تک سب کچھ مغربی بنیادوں پر استوار کی جاتی ہیں۔ علم کے مابعد جدید میدانوں نے خدا اور مذہب کو اب بس رسمی طور پر اور وہ بھی اختیاری انداز میں باقی رکھا ہوا ہے، چاہیں تو مانے اور پڑھیں اور نہ چاہیں تو نہ پڑھیں۔ عام طور پر علوم وفنون اور ترقی کے میدان مذہبی یا خدائی علم سے یکسر خالی ہیں۔ اسی طرح ہماری تہذیب و ثقافت میں بھی مغربی اندازِ زیست اور اندازِ معاشرت کا بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مابعد جدیدیت کے نظریات اور اس سے پیدا شدہ صورتحال ہم بیان کر چکے، ضرورت اس امر کی ہے اس صورتحال کو جب تک ہم مابعد جدیدیت کے فریم کے اندر مذہبی اور خدا کے بندے ہونے کی حیثیت سے نہ دیکھیں اس وقت تک ہم اس کا صحیح طور رد بھی پیش نہیں کر سکتے۔

جیسا کہ ڈینیل بیل جو کہ مابعد جدیدیت کا مفکر ہے وہ اپنے ہم عصر مفکرین سے اختلاف کرتے ہوئے دعویٰ کرتا ہے کہ "اب مابعد جدید دور میں منفیت اور عدمیت سے بچنے کا واحد راستہ صرف مذہب کی طرف واپسی ہی ہے، وہ دور مابعد جدید کا اس لیے بھی ناقد ہے کہ اس کے خیال میں اس نے ہماری اخلاقی اقدار کو تباہ کر کے جوش و خروش کے ساتھ لذیت پرستی کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ بیل کے نزدیک 60ء کی دہائی میں مابعد جدیدیت کی ایک لہر اٹھی جس نے اسے دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دیا۔ مابعد جدیدیت نے برہنہ کلچر متعارف کروایا جو کہ اب چار سو پھیل چکا ہے اس کے نتائج اور منطقی انجام کو سب آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس نے منفیت سے بھرپور طرز زیست متعارف کروایا"[40]

مسلم معاشرے بھی اس صورتحال میں ڈھلنے سے کچھ زیادہ دور نہیں ہیں۔ جدید اور مابعد جدید طرز زندگی اختیار کرنے والے مسلم کے لیے بھی اُس وقت آخرت کی فکر ایک ثانوی حیثیت اختیار کر جاتی ہے جب اس کا معیارِ زیست مغرب کا طرزِ زیست ہو۔ پھر ایسے شخص کو صحابہ کرام کی زندگیاں گزارنے کا طریقہ بھی پس ماندہ اور پرانا نظر آتا ہے۔ وہ ایسا کہنے کی جرات تو نہیں کرتا لیکن وہ اپنی زندگی کو نئے طرز زیست میں ڈھالنے کی کوشش میں مصروف عمل رہتا ہے۔ اور اسی طرح اسلامی نظریات کی مغربی نظریات و خیالات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوششوں مصروف رہتا ہے۔

اسی طرح اگر غور کیا جائے تو یہ بات بھی سمجھ میں آتی کہ موجودہ دور میں ہمارے ارد گرد موجود جدید ٹیکنالوجی کا جو ایک جہان آباد ہے، جس میں کہ ہم خود بھی اس حد تک داخل ہو چکے ہیں کہ ہمارے وقت گزارنے، کاروبار کرنے، حتیٰ کہ علم کا حصول بھی اب اس ٹیکنالوجی کے بغیر محال نظر آتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

الاوان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب[41]

"جان لو! کہ جسم میں ایک ایسا ٹکڑا ہے، اگر وہ ٹھیک ہو جائے تو سارا جسم ٹھیک ہو جاتا ہے اور اگر اُس میں فساد آ جائے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے، اور وہ قلب ہے"

اسلام نے غور و فکر، عقلیت اور علم حاصل کرنے پر جتنا زور دیا ہے، اتنا کسی دوسرے مذاہب میں نہیں۔ عقل اور فہم کی اہمیت کو بعض اسلامی فکر کے حاملین نے کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کے اس نقطہ نظر کو اسلامی فکر کا مرکزی نقطہ نظر سمجھنا اسلامی فکر

کے مزاج سے میل نہیں کھاتا اور قرآن کی اس عمومی فکر سے متصادم ہو جاتا ہے جس میں انسانوں کو عقل و فہم کے استعمال پر اکسایا گیا ہے۔

سید نصر حسین ایک مشہور مسلم مفکر ہیں، وہ مسلمانوں کے مغرب کی نسبت پیچھے رہ جانے اور ان کی بود باش اپنانے پر اپنی مایوسی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"یعنی آکسفورڈ اور ہارورڈ کے عقلمند ترین سٹوڈنٹس بھی مغرب اور اس کے مستقبل کے بارے میں اتنے پر اعتماد نہیں ہیں، جتنے مشرق کے جدید ذہن رکھنے والے ایسے لوگ جنہوں نے اپنا سب کچھ مغرب پر قربان کر دیا ہے"[42]

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ مسلمانوں کے روایتی مفکر ابھی تک مغرب کو اسی عیسائی عصبیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جو کہ ہماری تاریخ میں عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کو سازشوں کی شکل میں درپیش تھی، اسی عصبیت کی نتیجے میں کئی صلیبی جنگیں اور خونریز معرکے ہوئے۔ اور ہمارے روایتی مفکر ابھی تک مغرب کے ساتھ بحث و مباحثہ اور تقابل کے نتیجے میں عیسائیت کے رد میں مصروف ہیں۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ عیسائیت کی طرف سے مسلم دنیا کو آج بھی چیلنجز درپیش ہیں، اور اس کی تردید اور اسلام کی تبلیغ بھی مسلمانوں کے عمل کا ایک مستقل حصہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس سے زیادہ بڑا اور سنگین چیلنج اس وقت مغربی تہذیب، کلچر، تعلیم، رہن سہن، زبان، اور فکر و خیال کا چیلنج ہے جو کہ خاموشی کے ساتھ ہمارے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ اور سب سے بڑے خطرے کی بات یہ ہے کہ اس چیلنج میں خدا کہیں موجود ہی نہیں ہے، اور خدا کے تصور، احساس، اور خیال کے بغیر ایک تہذیب، کلچر، تعلیم، ادب، اور فکر و خیال ہم میں جڑیں پکڑ چکا ہے۔ آج کا مغربی فکر و عمل مکمل طور پر خدا کے تصور، وجود، اور احساس سے خالی ہے۔ حتیٰ کہ خدا کے ذکر سے ہی سے نفرت کی حد تک (نعوذ باالله) بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ اور ہم مغرب کو صرف عیسائیت کی نظر سے ہی دیکھتے اور اس کا رد کرتے رہ گئے۔

اب ہر مسلم مفکر اور منبر و محراب کی یہ اشد ضرورت ہے کہ وہ تمدنی صورتحال کی سنگینی کا باریک بینی سے مشاہدہ کرے اور پھر اپنے ارد گرد کی صورتحال کو جانچتے ہوئے اپنے لوگوں کے لیے مشعل راہ بنے اور انہیں بھٹکنے سے بچائے، اور آج یہ ضرورت ہر اس صاحب حیثیت اور علم و فن کے ماہر مفکر کی ہے جو رسول الله صلی الله علیہ وسلم نے حضرت علی رضی الله عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجتے وقت اختیار کی، جب حضرت علی رضی الله عنہ نے فرمایا کہ "یا رسول الله صلی الله علیہ وسلم! آپ مجھ جیسے کم عمر کو اتنے بڑے عہدے پر تعینات کر کے بھیج رہے ہیں جبکہ مجھے تو اس شعبہ قاضی القضاء کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ اس پر آپ صلی الله علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بات نہیں، "ان الله سیهدی قلبک، ویثبت لسانک" الله تمہارے دل کی رہنمائی کرے گا اور تمہاری زبان کو ثبات عطا کرے گا"[43]

---

## حواشی و حوالہ جات

[1] Jencks, Charles, Critical modernism, Where is Post-modernism going? Sussex England: Wiley Academy, 2007, 110

[2] Jencks, Charles, Critical modernism, where is Post-modernism going? Sussex England: Wiley Academy, 2007, 111

[3] اقبال، محمد ظفر، اسلام اور جدیدیت کی کشمکش، لاہور: کتاب محل، 41

[4] جلال پوری، علی عباس، روایات فلسفہ، لاہور: تخلیقات 2010، 27

[5] Vargish, Thomas, "Modernism" in Routledge Encyclopedia of Philosophy, [ed., Edward Craig], Londown and New York: Routledge, 1998, 5572

[6] منظور احمد، چند تعلیمی مسائل، مشمولہ اسلام–چند فکری مسائل، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، 2004، 169

[7] سوری، عبد الوہاب، مغربی تہذیب کے اصول ومبادی، مشمولہ سرمایہ دارانہ نظام: ایک تنقیدی جائزہ، کراچی: الغزالی پبلی کیشنز، 2009، 56

[8] Jencks, Charles, What is Postmodernism?, (London, UK: Academy Editions, 1996), 20

[9] آفاقی، اقبال، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں، 163

[10] Rudolf Pannwitz, Die Krisis der Europaeischen Kultur (Nuenberg: Hans Carl, 1917), 64,Cited in Modernity, Postmodernity and Islamic tradition, Humaira Ahmad, PhD thesis, Lahore, University of the Punjab,2004, 73

[11] www. Wikipedia.org/wiki/postmodernism

[12] ندیم، احمد، پروفیسر، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت اور اسلامی تعلیمات، لاہور: کتاب محل، 2016ء، 120

[13] Ihab Hassan, The Postmodern Turn: Essays in Postmodern Theory and Culture (Ohio Columbus, 1987), 25

[14] آفاقی، مابعد جدیدیت فلسفہ اور تاریخ کے تناظر میں، 164

[15] مابعد جدیدیت فلسفہ و تاریخ کے آئینے میں، 190

[16] Lyotard, Jean-Francois, Jean, The Postmodern Condition: A Report on knowledge, Translation from the French by Geoff Bennington & Brian massumi, (Manchester: Theory and History Literature volume 10), P xxiii

[17] Lyotard, J.F. The Postmodern condition, P. xxiv

[18] Lyotard, Postmodern Condition P36

[19] Jameson, Fredric, Postmodernism, or the Cultural Logic of Late Capitalism, (Durham, USA: Duke University press,1997)35

[20] Baudrillard, Jean, Simulacra and simulations, Translated by: Glaser, Sheila-Faria, (USA: The University of Michigan Press, 1994), 81

[21] Derrida, Jacques, Margins of philosophy, Translation by Alan Bass, (Chicago: The Harvester Press, 1982) 310

[22] نارنگ، گوپی چند، ساختیات اور مشرقی شعریات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1994، 205

[23] Barthes, Roland, Criticism and Truth, Translated by Katrine Pilcher Keuneman, (London: The Athlone Press 1987), 35

[24] آفاقی، اقبال، ڈاکٹر، اثبات، فیصل آباد: ممبیٔ و نقاط، 2012، 57

[25] Focault, Michel, What is Author? In textual strategies, 1969, 299-314

https://www.open.edu/openlearn/ocw/pluginfile.php/624849/mod_resource/content/1/a840_1_michel_foucault.pdf

[26] Focault, Michel, The Archeology of Knowledge, (New York: Pantheon Books 1972), P27

[27] اقبال، محمد ظفر، اسلام اور جدیدیت کی کشمکش، 82

[28] احمد، منظور، ثبات، تغیر اور نشاۃ ثانیہ، مشمولہ اسلام، چند فکری مسائل، 212

[29] Hegel, W.F, Georg, The Philosophy of History, New York: Cosimo, Inc., 2007, 39

[30] Huntington, Samuel P., The clash of civilizations and the remaking of word order, New York: A touchstone books, 1997

[31] CF. Foucault, The Order of Discourse, Untying the text Edited by: Young, Robort, (Boston, London: Oxford, Routledge & kegan paul, 1981), 129

[32] Appignanesi, Richard & Garratt, Chris, Introducing Postmodernism (Cambridge, UK: Icon Books Ltd, 2004), 83

[33] Fukuyama, Francis, The End of History and the Last Man, (New York: The free press, A division of macmillan, Inc, 1992), 339

[34] منظور احمد، ثبات، تغیر اور نشاۃ ثانیہ، مشمولہ اسلام چند فکری مسائل، 215

[35] ایگلٹن، ٹیری، مابعد تھیوری نظریے کے تعاقب میں، مترجم: طارق کامران، لاہور: عکس پبلیکیشنز، 2019، 13

[36] Postman, Neil, Technopoly, New York: Vintage Books, 1993, 9

[37] Postman, Neil, Technopoly, New York: Vintage Books, 1993, 7-20

[38] Pippen, Robert B, Modernism as a Philosophical Problem: on the dissatisfaction of European High Culture, Chicago: Chicago University Press, 1992, 2

[39] Vattimo, Gianni, The End of Modernity: Nihilism and Hermeneuties in Postmodern Culture, [Trans., Jon R. Snder], Baltimore: John Hopkins University press, 1988, 32

[40] Bell, Danial, The Coming of Postindustrial Society, A Venture in Social Forecasting, (New York: Basic Books, 1973), 477

[41] بخاری، محمد بن اسماعیل، الصحیح البخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرا الدینہ، جلد 1، 31

[42] Nasr, Hossein, Seyyed, Islam and the plight of modern man, Chicago: ABC international group, 2001, 205

[43] ابی داؤد، سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، کتاب القضاء، باب کیف القضاء، جلد 1، 148